نظریۂ ارتقاء اور دانشورانِ اسلام

(۲)

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

شیخ محمد عبدہ کی تاویلات کا اثر

چنانچہ شیخ فرید وجدی نے اپنی کتاب "دائرۃ معارف القرن العشرین" میں اور شیخ عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اگر نظریۂ ارتقاء علمی اعتبار سے ثابت ہوجائے تو پھر قرآن میں مذکور قصۂ آدم کو اس کے ظاہری نصوص سے پھیر دینا ممکن ہوجائے گا[1] جب کہ یہ دونوں حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنی نصوص قطعی ہیں اور اس کی ظاہری آیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو اس کا حاصل وہی قرآن کی قطعیت میں شک و شبہ پیدا کرنا اور ارتیابیت کی دعوت دینا ہے۔ ایک طرف قرآنی نصوص پر ایمان رکھنے کا بھی دعویٰ ہے اور دوسری طرف اس کی قطعیت کے بارے میں تردد کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے۔

---

[1] دیکھئے دائرۃ معارف القرن العشرین: ۱/۱۲۷ اور قصص الانبیاء: ص ۱۴

اس قصے کے بارے میں عام طور پر مصری علماء کا موقف یہی ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس میں اس وقت اُمت مسلمہ گرفتار اور حیران و سرگرداں ہے کہ وہ کس کی بات مانے اور قرآن حکیم پر کس طرح ایمان لائے؟ سرسید احمد خاں نے جب نیچریت کا دروازہ کھولا تو اس وقت کے بعض علماء نے ان پر کفر کے فتوے لگائے اور ان کے خلاف ایک اچھا خاصہ لٹریچر تیار کر دیا[۵] مگر اس کے برعکس شیخ محمد عبدہ کے خیالات کو قبول عام حاصل ہوگیا۔ محض اس لئے کہ وہ ایک عالم دین اور عالم عربیت تھے۔ لہذا کسی نے بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھولی۔ گویا کہ اُن کے علم اور اُن کی عربیت کی عبا نے اُن کے سارے عیوب چھپا دئے۔

بہر حال عالم اسلام میں ان دونوں حضرات کے خیالات کی بازگشت اکثر و بیشتر سنائی دیتی ہے۔ اور ہندوپاک کے بہت سے اہل علم اور دانشور بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لہذا اس موقع پر اس کا ایک مختصر سا تنقیدی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال نے اپنے خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam (تیسرے خطبے میں) جہاں پر قصۂ آدم سے بحث کی ہے تو وہ اسی تمثیلی انداز میں ہے جو ان دو پیش روؤں کا انداز ہے۔ مگر اقبال چونکہ ایک فلسفی ہیں اس لئے اس قصے کو بھی ایک مکمل فلسفے کی شکل دیتے ہوئے اس پر کئی صفحات سیاہ کر دئے ہیں۔ اور اس کا حاصل بھی ان کے نزدیک وہی ہے کہ

---

۵ دیکھئے "اسلامی علوم وفنون ہندستان میں" از مولانا سید عبدالحئی، ص ۳۲۱، ۱۹۶۹ء۔

اس سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں (بلکہ بحیثیت مجموعی نوع بشری کا تذکرہ ہے)۔ [1]

اقبال کے مجمل بیان کی تشریح کرتے ہوئے اقبال کے ایک شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکر اقبال" میں تحریر کرتے ہیں: "قرآن جس آدم کو پیش کرتا ہے وہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ انسانیت کا ایک تصور ہے۔ قرآن نے آدم کے لفظ کو انسانیت یا نوع انسان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔" [2]

علامہ اقبال کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہے، مگر جہاں تک اسلامی عقائد کا معاملہ ہے تو اس میں اقبال تو کیا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بخشا نہیں جا سکتا، خواہ وہ کتنی ہی قدآدر کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں محمد عبدہ اور اقبال سے زیادہ اسلام اور قرآن عزیز ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اس موقع پر اپنے اس قیاس کے لئے ایک قرآنی آیت کو بطور ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہتر ہے کہ اس موقع پر خود موصوف ہی کی عبارت پیش کر دی جائے جو یہ ہے:

"..... آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا، لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ق فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ" [3]

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ از سید نذیر نیازی، ص ۱۲۶، طبع جدید دہلی، ۱۹۸۶ء۔
[2] فکر اقبال، ص ۴۹۵، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء۔
[3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۲۶۔

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورت گری کی پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (اعراف : ۱۱)

اقبال کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس آیت کریمہ میں ضمیریں جمع مخاطب کی لائی گئی ہیں اس لئے یہ کسی ایک انسان کا تذکرہ نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ شبہ دراصل قرآنی اسلوب اور اس کی بلاغت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ سے قرآن درحقیقت پوری نوع انسانی کا شرف بڑھانا چاہتا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ مجموعی طور پر تمہاری سب کی تکریم کی غرض سے تھا، گویا کہ یہ واقعہ صرف آدم کے ساتھ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آیا ہے اور اس کی نظیر قوم یہود سے قوم یہود سے طرز تخاطب میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ تا ۴۷ میں مختلف آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں دور رسالت میں موجود یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے تاریخی واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ واقعات انھیں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ان واقعات میں اللہ کے احسانات کو بھی گنایا گیا ہے جو قوم یہود پر ہوئے تھے اور ان کی لغزشوں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کیا گیا ہے گویا کہ ان کا ارتکاب خود نزولِ قرآن کے دور میں موجود یہودیوں نے کیا تھا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ : اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ (بقرہ : ۵۷)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ : اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے (بقرہ : ۶۱)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ : اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہ طور بلند کیا۔ (بقرہ : ۶۳)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ : پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ (البقرہ : ۷۴)

دیکھئے یہ نادر اس قسم کی دیگر آیات میں کس طرح ماضی کے واقعات کے ذریعہ زمانۂ حال کے لوگوں سے خطاب کیا جارہا ہے، گویا یہ سب کچھ حال والوں کے ساتھ پیش آیا ہے! یہ قرآن حکیم کا ایک معروف اور بہت بلیغ اسلوب ہے۔ امام رازی نے بھی تقریباً یہی توجیہ اختیار کی ہے[۱] اور علامہ زمخشری فرماتے ہیں: (وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ) یعنی خلقنا أباكم آدم طيناً غير مصور ثم صورناه بعد ذلك[۲]

ڈاکٹر رفیع الدین اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال کے بعد انہی کے ایک نام لیوا دوسرے فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین میدان میں آئے اور اس سلسلے میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض کلامی تحریریں اگرچہ بہت وقیع اور فکر انگیز ضرور ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتاب "قرآن اور علم جدید" تعارض و تضاد کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ جس میں موصوف نے قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ نظریۂ ارتقاء کو غلط، ایک خلاق ہستی کا منکر اور کافرانہ نظریہ

۱؎ دیکھئے تفسیر کبیر : ۲۹/۱۴ — ۳۰، طبع جدید۔

۲؎ تفسیر کشاف : ۶۸/۲، مطبوعہ طہران۔

وغیرہ وغیرہ بھی کہتے ہیں، مثلاً :

"ڈاروِن ارتقاء کے اسباب کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ ان کو درست تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کائنات کی تخلیق میں کسی قادرِ مطلق ہستی کے دخل یا عمل کو یا خود کائنات ہی کے کسی مقصد یا مدعا کو ذہن میں لا سکیں۔"[1]

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں :

"ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا مغرب کے تمام کا فرانہ فلسفیانہ نظریات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے........ سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈاروِن ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کلیہ بالخصوص کارل مارکس، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر اور میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے ..... یہ فلسفے ڈاروِن کے نظریہ سے براہ راست نہیں تو اس سے بالواسطہ طور پر گہری طرح سے متاثر ہیں۔ ان سب کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔"[2]

مگر اس کے باوجود اس کو قرآن سے صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنا سارا زور بھی صرف کر دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں بعض متشابہات یا مبہم آیتوں کا سہارا لے کر محکمات تک کو متشابہات کے تابع کرتے ہوئے من مانی اور رکیک قسم کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم کو سمجھنے کا یہ الٹا رخ ہے۔ اور صحیح رخ یہ ہے کہ

---

[1] قرآن اور علم جدید، ص ۳۷، طبع چہارم، ۱۹۸۱ء، لاہور۔

[2] ایضاً ص ۱۳۷ — ۱۳۸

اُس کی متشابہات کو اس کی محکمات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ مگر مصنف چونکہ "ارتقا" کی عینک چڑھائے ہوئے ہیں اس لئے انھیں قرآن کے ہر ہر لفظ میں ارتقا ہی ارتقا نظر آرہا ہے۔ میری نظر میں قرآن حکیم پر اپنے نظریات زبردستی لادنے کی یہ ایک بدترین مثال ہے جس کے ذریعہ قرآن فہمی کے اصولوں کا خون ہوتا ہے اور عقل سلیم اس سے اِبا کرتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات پر اس وقت تفصیلی بحث کی تو گنجائش نہیں ہے، مگر مجموعی طور پر عرض ہے کہ موصوف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ارتقا اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، مگر وہ غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر ہوتا ہے۔ بس یہی ایک فرق نظر آتا ہے ان کے اور ڈاروِن کے نظریہ میں۔ مگر وہ اتنا کہہ کر ڈاروِن کے نظریہ کو مسلمان نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہ ارتقا کو علمی اعتبار سے صحیح ثابت کرتے۔ اس کو مسلمان بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ جب ارتقا ہی ثابت نہیں ہے تو پھر قرآن عظیم کو نہایت درجہ بھونڈے طریقے سے کھینچ تان کر مطابق ارتقا ثابت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بلکہ اب تو خود ماہرین حیاتیات ہی اس غلط اور نامعقول نظریہ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں، جیسا کہ پہلے باب میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث راقم سطور نے اپنی کتاب "قرآن حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں کی ہے، جو زیر تکمیل ہے۔

احمد باشمیل اور اُن کا اُصول باطل۔

اسی طرح احمد باشمیل نامی ایک عربی داں نے ایک کتاب "الاسلام و نظریۃ داروِن" کے نام سے لکھی ہے، جس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ

عجیب بات بھی مذکور ہے کہ اگر کسی کو نظریۂ ارتقا کی تردید کرنی ہو تو وہ اس کو صرف اپنی طرف سے کرے قرآن کو درمیان میں نہ لائے، مبادا کہ یہ نظریہ آئندہ چل کر صحیح ثابت ہو اور قرآن متہم ہو جائے۔ مگر موصوف نے دوسری طرف خود ہی قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق دیتے ہوئے قرآن کے اُن قطعی نصوص میں بھی جو ارتقا کے خلاف ہیں، تاویل کر کے ان کو مطابق ارتقا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اللہ اللہ! ایک طرف تو احتیاط کا یہ عالم، اور دوسری طرف مرعوبیت کی یہ انتہا!! مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر نظریۂ ارتقا غلط اور باطل ثابت ہو جائے تو پھر خود اپنی توجیہ و تعلیل کا کیا ہوگا؟ کیا اس صورت میں بھی قرآن متہم نہیں ہو جائے گا؟ آخر یہ "ون وے ٹرافک" کیوں اور کس لئے؟

غرض اس غلط اور باطل اصول کا مطلب یہ ہوا کہ قرآنِ حکیم سے اس غیر ثابت شدہ نظریہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے مگر اس کی تردید نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم مادہ پرستانہ نظریات کی تائید کے لئے نازل ہوا ہے ان کی تردید کے لئے نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانی نظریات و مفروضات کے تابع ہے اور انسانی نظریات جس طرف بھی جائیں گے قرآن کو بھی خواہی یا ناخواہی اسی طرف جانا پڑے گا۔ یہ عجیب و غریب قسم کی قرآن دانی ہے، جو قرآن حکیم جیسی باطل شکن کتاب کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر بحث محض نظریات و مفروضات کے سلسلے میں ہے۔ اس کے برعکس علوم طبیعی (NATURAL SCIENCES) کے وہ ثابت شدہ حقائق جو مسلسل تجربے و مشاہدے کے باعث "قوانین فطرت" کا درجہ حاصل کر چکے ہوں، ان کا انکار مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے

حقائق کی قرآن حکیم تصدیق و تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خود علوم جدیدہ قرآن حکیم کی ابدی سچائیوں کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ راقم سطور نے اس موضوع پر اپنی دیگر تصانیف میں تفصیلی بحث کی ہے۔

مولانا آزاد اور نظریۂ ارتقا

اس سلسلے میں دو اہم شخصیتوں کا تذکرہ کئے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔ ان میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ چنانچہ اول الذکر نے اپنی تفسیر میں جہاں پر ربوبیت کی تفصیل کی ہے تو وہاں پر انھوں نے نظریۂ ارتقار کا تذکرہ اس حیثیت سے کیا ہے گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگرچہ موصوف نے آدم کی شخصیت کو تمثیل قرار دینے سے احتراز کیا ہے، مگر ارتقا کی تشریح بالکل اسی انداز میں کی ہے جس طرح کہ مادہ پرست کرتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا ایک اولین خلیہ یا بیج سے ہوئی جس کو پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ پھر اس میں ایک مدت مدید کے ارتقا کے بعد ادنا سے اعلیٰ درجے کی کڑیاں ظہور میں آئیں یہاں تک کہ لاکھوں سال کے ارتقا کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ انسان کے بعد بھی موصوف کے نزدیک ارتقا ممکن ہے[1]

اور موصوف نے یہ سب دلیل آخرت کے ثبوت کے طور پر تحریر کیا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے اس سے آخرت کا ثبوت تو کجا خود ربوبیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود بخود ترقی کرتے کرتے آپ سے آپ ظاہر ہوتی جائے اس میں

---

[1] دیکھئے ترجمان القرآن : ۱/۳۷، مطبوعہ دفتر ترجمان دہلی، ۱۳۵۰ھ

ملا ربوبیت کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے ارتقاء ربوبیت کی نقیض ہے ورنہ ربوبیت ارتقا کی۔ مادہ پرست نظریۂ ارتقا سے اسی لئے چمٹے ہوئے ہیں کہ انھیں یک خالق یا برتر ہستی کے وجود کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ ارتقا علمی اعتبار سے بجائے خود ثابت نہیں ہے۔ مگر مادہ پرست اس نظریہ سے دست بردار ہونے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ بصورت دیگر انھیں ایک خلّاق ہستی (CREATOR) کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر چونکہ انھیں خدا کے نام ہی سے ایک قسم کی چڑ سی ہوگئی ہے لہذا وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ لہٰذا ایک مادہ پرست کا اس نظریہ کو اپنانا اور اس سے چمٹے رہنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ایک عالم دین کا اس سے اس حد تک متاثر ہو جانا گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، بالکل ناقابل فہم ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس سے خالق ارض وسما کی ربوبیت و خلاقیت پر حرف بھی آتا ہو۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور نظریۂ ارتقا

اب رہا معاملہ علامہ سید سلیمان ندوی کا، تو مجھے ندوی برادری کا ایک فرد ہونے اور بیک واسطہ علامہ موصوف کا شاگرد ہونے بلکہ آپ کی متعدد تصنیفات سے تلمیذانہ طور پر مستفید ہونے کے باوجود اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ موصوف سے بھی اس مسئلے میں کچھ لغزش اور بے احتیاطی ہوگئی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک مضمون "مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید" کے عنوان سے "الندوہ" کے جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے بعض قرآنی آیات کو "مطابق ارتقا" دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دیگر علماء کی طرح موصوف کے بیانات میں ادعائیت نہیں ہے،

بلکہ اس کو ایک ممکنہ تاویل قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے مضمون کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"علمار کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم نے مذکورہ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دئے ہیں، ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کردینا ہے، گو مفسرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھتے ہیں، اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل ونقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لئے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں۔" [1]

اصل میں سید صاحب بھی ارتقائیوں کے پروپگنڈے سے متاثر نظر آتے ہیں اور تاویل کے سلسلے میں انھوں نے بھی تقریباً مصری علمار کا موقف اختیار کیا ہے۔ نظریہ ارتقا کے سلسلے میں یہ ساری غلط فہمی اس بنیاد پر ہے کہ یورپ کے تمام سائنس والوں نے اس مسئلے کو گویا کہ اجماعی طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے سید صاحب کے مذکورہ بالا مضمون سے سات ماہ پہلے "الندوۃ" ہی کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارے میں "مسئلہ ارتقا اور ڈاروِن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس میں اس کی طرف اشارہ اس طرح کیا تھا:

"لیکن ایسا مسئلہ جس کو تقریباً یورپ کے تمام حکمار تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے۔" [2]

واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے یہ مضمون محض فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرتے

---

[1] مقالات سلیمان: ۱۷۴/۳، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۷۱ء

[2] مقالات شبلی: ۶۲/۷، ۱۹۵۳ء

ہوئے اس سلسلے میں بعض حکمائے اسلام کے نظریات بیان کئے ہیں۔ مگر اس میں قرآن مجید سے نفیاً یا اثباتاً کوئی استدلال نہیں کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی نوعیت کا مضمون ہے۔

غرض خود سید صاحب نے بھی اپنی حسب ذیل عبارت کے ذریعہ کچھ اس قسم کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ مسئلہ اجماعی طور پر طے شدہ ہے:

"مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو مسئلہ ارتقا کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے بلکہ اس مسئلہ کی صحت کا اس کو اس درجہ اعتقاد ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلہ ارتقا کا منکر ہے تو کون مانے گا کہ قرآن پاک جدید فلسفے کے بالکل مطابق ہے؟ یورپ کے کل علمائے طبعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں" [۱]

یہ ہے وہ پس منظر جس میں یہ مضامین اضطراری طور پر سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ یورپ کے تمام حکماء اور کل علمائے طبیعیات اس نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے اور علمائے اسلام کی ایک خاص تعداد مغرب کے اس پروپیگنڈے سے متاثر نظر آتی ہے جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ماہرین حیاتیات (BIOLOGISTS) کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اس کو محض ایک مفروضہ (HYPOTHESIS) سمجھتی ہے حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس نظریہ کے حامی ہیں، جب کہ متعدد سائنس داں اور ماہرین معقول دلائل کی بناء پر اس کو غلط بھی قرار دیتے ہیں لہٰذا یہ کوئی اجماعی یا طے شدہ مسئلہ نہیں ہے۔

---

[۱] مقالات سلیمان: ۳/۱۶۴

بہرحال سید سلیمان ندوی کے مضمون پر اگر علمی دیانت داری کے ساتھ تبصرہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ موصوف اس سلسلے میں مصری علماء ہی کی طرح تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس سلسلے میں جو دلائل بیان کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا[۱] مگر پھر خوشامی یہ کہتے ہوئے کہ "اگر مسئلہ ارتقا صحیح بھی ہو تو قرآن اس کا منکر نہیں" بعض قرآنی آیات کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ قرآن ارتقا کی تائید کر رہا ہے۔ اور اس سلسلے امام راغب اصفہانی کی ایک مجمل عبارت کا حوالہ بھی دیا ہے[۲]۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب جیسے صائب اور راسخ العقیدہ صاحب علم کی نگارشات میں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر ہے جو ذرا "ڈھیلے ڈھالے" قسم کی ہے۔ مگر جیسا کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے "مقالات سلیمان" کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ یہ مضمون سید صاحب کے ابتدائی دور کا ہے، جو بعد کے ذوق سے مختلف ہے۔

ارتقا کا جادو چل نہیں سکتا

واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے بعض علمی حلقوں ـــــ خصوصاً مصری علماء کے نزدیک ـــــ یہ ایک چلا ہوا فقرہ بلکہ ایک فیشن سا بن گیا تھا کہ "نظریۂ ارتقا اول تو ثابت نہیں ہے، اور اگر ثابت ہے تو قرآن اس کا منکر نہیں ہے۔" مگر سوال یہ ہے کہ جب ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے تو پھر اس کو صحیح ثابت کرنے کا بیڑا ہی کیوں اٹھایا جائے اور اس کو مستقبل کے مفسر کے حوالے کیوں نہ کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ جو چیز

---

[۱] و [۲] مقالات سلیمان، ص ۱۶۷ ـــ ۱۶۹

بجائے خود ثابت نہیں ہے اس کو ثابت کرنے کے آخر ہم خود مکلّف کیوں ہوں؟ اور وہ بھی قرآن عظیم جیسی کتاب میں تاویل کرکے! فرض کیجئے زمانہ مستقبل میں اگر تمام سائنس داں اس نظریہ سے اپنی دست برداری کا اعلان کر بیٹھیں، تو کیا اس غلط تاویل کا برا اثر نہیں پڑے گا؟ اور اس کی وجہ سے گمراہ فرقوں اور طبقوں کو اپنی من مانی تاویلات کے لئے بڑھاوا نہیں ملے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک کمزور موقف ہے جس کی وجہ سے قرآن حکیم بجائے خود مشکوک ہو جائے گا اور اس کی قطعیت متاثر ہو جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک "لاریب فیہ" صحیفہ ہے جس میں اس قسم کی چناں وچنیں کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے کوئی بات ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بغیر کسی تاویل یا انحراف کے صرف اس کے ثابت شدہ نصوص یا واضح بیانات (جو اصول فقہ کی زبان میں عبارۃ النص اور اشارۃ النص وغیرہ کہلاتے ہیں) سے استدلال کیا جائے۔ اور مجمل ومبہم آیات (متشابہات) کو مفصّل یا غیر مبہم آیات (محکمات) کی روشنی میں سمجھا جائے۔ ان اصولوں کی رو سے بغیر کسی تاویل کے جو مفہوم ثابت ہوگا وہ قابل استدلال ہوگا اور اس کو قرآن کا صحیح مفہوم ومنشا قرار دیا جائے گا۔ تمام علمائے حق کا طریقہ کار یہی رہا ہے اور اسی میں سلامتی ہے۔

غرض خدا کی شان دیکھیئے جس نظریہ کے متعلق ایک "متفق علیہ" مسئلہ ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا وہ لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے باوجود اب تک نہ صرف ایک مفروضے سے آگے بڑھ نہیں سکا ہے، بلکہ اب تو محققین اور اہل بصیرت اس مفروضے سے اپنی بیزارگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ علمی حیثیت سے ثابت نہیں ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے جتنے بھی طریقے اپنائے جا رہے ہیں، ان سب میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔